مولانا محمد حنیف ندوی

اصطلاحاتِ حدیث

حدیث بنیادی طور سے دو خانوں میں انقسام پذیر ہے، یا تو مقبول ہے جسے محدثین کے حلقوں میں پذیرائی حاصل ہے، یا مردود ہے، جسے ان حلقوں نے شرفِ قبول نہیں بخشا۔ اسے ضعیف کہہ لیجیے۔ پھر ان دو قسموں کے تحت بہت سی اقسام مندرج ہیں اور صحت و سقم کے اعتبار سے ان کا حکم مختلف ہے۔

اہلِ فن نے اس تقسیم پر "حسن" کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں۔ صحیح، حسن اور ضعیف۔ حسن کے بارے میں اختلاف رائے ہے، سوال یہ ہے کہ کیا یہ حدیثِ صحیح کی قسم ہے یا حدیثِ ضعیف کی۔ ذہبی نے امام بخاری اور مسلم سے یہ تصریح نقل کی ہے کہ حدیثِ حسن، صحیح کی قسم ہے۔ اور امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ حسن اگرچہ ضعیف کی قسم ہے لیکن متروک العمل نہیں۔ یعنی قیاس کے مقابلے میں اس پر عمل پیرا ہونا بہرحال مستحسن ہے۔ حسن کے متعلق تیسری رائے یہ ہے کہ یہ مستقل بالذات شئ ہے، جو اگرچہ صحیح کے مرتبے پر تو فائز نہیں لیکن ضعیف سے قدرے فائق اور اعلیٰ ہے۔ ان اقسامِ ثلاثہ کے علاوہ اور بہت سی اقسام و انواع ہیں، جو کسی نہ کسی طرح انہی سے متعلق ہیں۔ ان سب کا استیعاب مشکل ہے۔ حازمی (ابو بکر محمد بن موسیٰ بن حازم الہمذانی) نے ان کی تعداد سو کے قریب بتائی ہے اور ابن الصلاح نے اپنی کتاب علوم الحدیث میں ان میں سے صرف پینسٹھ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ تقسیم کا یہ انداز حرفِ آخر نہیں۔ رواۃ اور متون کے احوال کے پیشِ نظر، تقسیم و تنویع کا یہ دائرہ بہت وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔

حدیثِ صحیح کی تعریف

حدیثِ صحیح کیا ہے؟ اس کی تعریف اہلِ فن کے نزدیک یہ ہے کہ یہ حدیث مسند سے عبارت ہے، جس میں سلسلۂ اسناد ابتدا سے انتہا تک اس نہج کا ہو کہ عدل ضابط، عدل ضابط سے روایت کرے تا آنکہ اس کو آنحضرتؐ تک یا صحابی و تابعی تک لے جائے۔ نیز یہ کہ اس حدیث کو شاذ اور معلل نہیں ہونا چاہیے۔ اس تعریف میں چند نکات کی وضاحت ضروری ہے۔ حدیثِ مسند سے یہ مراد ہے کہ سلسلۂ اسناد، موصول و متصل ہو۔ چنانچہ حدیثِ مرسل جس میں صحابی ساقط ہو، وصفِ اتصال سے ساقط ہوگی۔ اس کے بارے میں مذہب راجح یہ ہے کہ اس کو ضعیف گردانا جائے گا

صحیح نہیں۔ یہی حال روایت منقطع اور معضل کا ہے۔ کیونکہ ان کے سلسلۂ اسناد میں سے ایک یا دو شخص ساقط ہوتے ہیں، ان کو صحیح حدیث قرار نہیں دے سکتے۔ انقطاع کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ سند بظاہر تو موصول و متصل ہو لیکن رواۃ میں کوئی ایک شخص ابہام لیے ہوئے ہو۔

(۲) جب محدثین یہ کہتے ہیں کہ حدیثِ صحیح شاذ نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی ایسی روایت کی مخالفت نہیں پائی جاتی جو ثقات سے مروی ہو۔

(۳) حدیثِ صحیح کے معلل نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں علت قادحہ نہ پائی جائے یعنی اس میں کوئی ایسا نقص و عیب نہ ہو جو قدح کا سبب بن سکے۔

(۴) حدیثِ صحیح کے لیے رواۃ کا عادل و ضابط ہونا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں کوئی راوی ایسا نہیں ہونا چاہیے جس میں عدالت و ضبط کے تقاضوں کا فقدان ہو۔

عدالت کا اطلاق کن اوصاف پر ہوتا ہے، اس پر علما نے کافی غور و خوض کیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ عدالت ایسے ملکہ سے تعبیر ہے جو کبائر کے ارتکاب اور صغائر پر اصرار سے روکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عدالت سے مراد یہ ہے کہ راوی میں اطاعت و مروّت کا غلبہ ہو۔ غزالی نے اس کو استقامتِ سیرت سے تعبیر کیا ہے۔ اس پر الجوینی کا قول ہے کہ عادل وہ ہے جس کی خبر و اطلاع پر یقین کیا جا سکے۔ ظاہر ہے یہ محض عبارات کا اختلاف ہے۔ مقصد سب کا یہ ہے کہ راوی کی سیرت و کردار کو اس ڈھب کا ہونا چاہیے کہ اس کے بارے میں کذب اور جھوٹ کا گمان نہ کیا جا سکے۔

صحیح حدیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صحیح لذاتہ اور ایک صحیح لغیرہ۔ صحیح لذاتہ اس حدیث کو کہیں گے جو بذاتِ خود قبولیت و پذیرائی کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو، اور صحیح لغیرہ کے معنی یہ ہیں کہ حدیث بذاتِ خود تو اگرچہ حسن کے مرتبے کی ہے لیکن چونکہ دوسری روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے اس لیے یہ حسن کے دائرہ سے نکل کر صحیح کے دائرہ میں داخل ہو گئی ہے۔

پھر جس طرح حدیثِ صحیح کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسند و متصل سے تعبیر ہے، اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق یا آحاد سے ہے یا تواتر سے۔ جس کا تعلق آحاد سے ہو، اسے احادی کہتے ہیں اور جس کا تعلق تواتر سے ہو، اسے متواتر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

حدیثِ متواتر

وہ حدیثِ صحیح جسے اتنی بڑی جماعت روایت کرے کہ اس پر کذب اور جھوٹ کا گمان نہ کیا جا سکے، متواتر

ی ہے۔ بشرطیکہ اول سند سے لے کر وسط و آخر تک رواۃ کی کثرت جوں کی توں قائم رہے۔ رواۃ
داد کس قدر ہو جس سے کہ تواتر ثابت ہوتا ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک تحدید نہیں کی جا سکتی۔ بعض لوگوں
داد کی تعیین کی ہے۔ مثلاً قرآنِ حکیم میں ہے:

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ۔ (النور: ۱۳)

یہ اپنی بات کی تصدیق کے لیے چار گواہ کیوں نہ لائے۔

اس سے یہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تواتر کے لیے کم از کم چار رواۃ کا ہونا ضروری ہے۔ آیاتِ ملاعنہ میں پانچ
ر ہے۔ اس سے بعض نے یہ رائے قائم کی رواۃ کی تعداد پانچ ہونا چاہیے۔ بعض نے کہا کہ متواتر میں
سے کم راوی نہیں ہونے چاہئیں، کیونکہ اس سے کم تعداد پر جمع کا اطلاق نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا کہ
ل تعداد بارہ ہے، کیونکہ قرآن میں ہے:

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ (المائدہ: ۱۲)

اور ان میں ہم نے بارہ سردار مقرر کیے۔

بعض کی رائے میں یہ تعداد کم ہے، ان کے نزدیک بیس راوی ہونے چاہئیں۔ ان کا استدلال اس آیت سے ہے:

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (الانفال: ۶۵)

اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہے تو دو سو کافروں پر غالب رہیں گے۔

اسی طرح بعض نے چالیس اور بعض نے ستر رواۃ کا ہونا ضروری ٹھہرایا۔

لیکن جیسا کہ ابنِ حجر کا کہنا ہے کوئی خاص تعداد متعین نہیں، یہ سب اندازے ہیں، جن کا کوئی ثبوت پایا نہیں جاتا۔ متواتر کی دو قسمیں ہیں۔ متواتر لفظی اور متواتر معنوی۔ متواتر لفظی سے مراد جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، الفاظ کے تطابق کے لحاظ سے ایسی روایات ہیں کہ جن میں اول، وسط اور آخرِ سند تک رواۃ کی اتنی بڑی تعداد رہے کہ ان پر کذب یا جھوٹ کا گمان نہ کیا جا سکے۔

کیا حدیث کے موجود ذخائر میں متواتر لفظی کا ثبوت ملتا ہے؟ اس کے جواب میں اختلاف رائے ہے، ابنِ الصلاح کا کہنا ہے کہ جہاں تک مطابقت لفظی کا تعلق ہے، مشکل ہی سے کوئی حدیث متواتر کہی جا سکتی ہے۔ لیکن سیوطی، قاضی عیاض اور ابنِ حجر اس بات کے قائل ہیں کہ صحاح میں متعدد احادیث ایسی ہیں جنھیں متواتر کہا جا سکتا ہے۔ جیسے شق القمر کی حدیث، مسح علی الخفین کی حدیث۔ یا یہ حدیث: من کذب

علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ فی النار - کہ جس نے میرے بارے میں کذب و افترا سے کام لیا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے - ابن حجر کی تصریح کے مطابق اس حدیث کے راوی چالیس سے زیادہ ہیں اور سب کے سب صحابی ہیں - یہی نہیں ان میں دس وہ صحابہ بھی شامل ہیں، جنھیں جنت کا سزاوار ٹھہرایا گیا ہے، یعنی عشرہ مبشرہ

متواتر معنوی میں یہ ضروری نہیں کہ الفاظ کا بعینہٖ تواتر و تطابق، روایت کے ہر ہر طریق میں پایا جائے - بلکہ یہ کافی ہے کہ معنی کے لحاظ سے اس میں ایک طرح کا توافق ہو - اس نوع کی احادیث صحا میں کثرت سے پائی جاتی ہیں - سیوطی سے دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے کے بارے میں جو احادیث منقو ہیں، ان کی تعداد سو کے قریب بتائی ہے - اسی طرح اور بھی متعدد احادیث ہیں جو معناً متواتر کے زمرے میں شامل ہیں -

علمائے حدیث اس بارے میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتے کہ متواتر معنوی اول اول احادی ہو پھر طبقہ اولیٰ کے بعد طبقہ ثانیہ میں یہ مشہور و مستفیض ہو جائے - مثلاً انما الاعمال بالنیات (اعما کا دارو مدار نیتوں پر ہے) - ان احادیث میں شمار ہوتی ہے جنھیں علما نے متواتر معنوی کا درجہ دیا ہے حالا اس کے راوی صرف عمر بن الخطاب ہیں، اور عمر بن الخطاب سے روایت کرنے والے صرف علقمہ ہیں - اسی طرح علقمہ سے تنہا ابراہیم التیمی نے روایت کی ہے اور تیمی کا ماخذ روات صرف یحیی بن سعید انصاری ہیں اس طرح گویا یحییٰ بن سعید انصاری سے اس حدیث کی شہرت و استفاضہ کا آغاز ہوتا ہے، جب کہ اس پہلے کا سلسلۂ اسناد سراسر احادی ہے -

محدثین متواتر سے تعرض نہیں کرتے اس لیے کہ اس کا تعلق اسناد سے نہیں، یہ مسئلہ فقہا اور اصحاب اصول کا ہے - محدثین صرف ان احادیث سے بحث کرتے ہیں جن میں رواۃ و مرویات سے بحث کی جاسکے او یہ بتایا جاسکے کہ صحت و ضعف کے اعتبار سے ان کی حیثیت کیا ہے - متواتر میں، متن اور رجال پر گفتگو نہیں کی جاتی، کیونکہ یہ غیر مشروطا اور متفقہ طور پر واجب العمل ہیں -

احاد کے بارے میں البتہ اختلاف رائے ہے - سوال یہ ہے کہ کیا ان کی صحت ظنی ہے، یا یقینی - نوو نے "التقریب" میں ان کو ظنی الثبوت گردانا ہے - مگر جمہور محدثین کی یہ رائے ہے کہ جو احادیث صحیح بخا اور مسلم میں آگئی ہیں وہ سب قطعی اور یقینی ہیں - ابن حزم نے اس سے اتفاق نہیں کیا، ان کے خیال میں صحیح بخاری اور مسلم کی قید بے معنی ہے - ان کا کہنا ہے کہ ہر وہ خبر موجب علم و عمل ہے، جو عادل و ضابط روا

روی ہو۔

یثِ غریب

حدیثِ صحیح کی اس قسم کو غریب کہتے ہیں جس میں کوئی ثقہ راوی متفرد ہو۔ غرابت کا اطلاق کبھی متن کے
رسے ہوتا ہے اور کبھی اسناد کے اعتبار سے۔

یثِ مشہور

مشہور وہ حدیثِ صحیح ہے جس کو ثقہ سے بہت سے لوگ روایت کریں۔ یہ متواتر سے کم درجے کی ہوتی ہے۔

یثِ عزیز

اس حدیثِ صحیح کو عزیز کہتے ہیں جس میں سلسلۂ اسناد میں دو دو راوی ہوں۔ یہ عجیب بات ہے کہ بعض لوگوں
،حدیثِ صحیح کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ وہ عزیز بھی ہو۔

امام بخاری وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے خالصتہً صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام کیا۔ ان کی تالیف میں
سال، انقطاع، بلاغات کے قبیل کی کوئی چیز پائی نہیں جاتی۔ ہاں یہ البتہ ممکن ہے کہ ان کے ہاں "تعالیق"
ئ جاتی ہیں۔ لیکن تعالیق اصل کتاب کا حصہ نہیں۔ ان کو محض استشہاد کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ امام بخاری
، بعد دوسرے شخص امام مسلم ہیں، جنھوں نے اپنی تالیف میں اس معیار کو قائم رکھا۔ امام مالک اس زمرے
ں شامل نہیں۔ کیونکہ ان کی تالیف میں مراسیل، مقاطیع اور بلاغات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

صحتِ حدیث کے متعدد مراتب ہیں۔ ایک حدیث صحیح ہوتی ہے اور ایک صحیح تر۔ محدثین کی اصطلاح میں
سے اصح الحدیث سے تعبیر کیجیے۔ نووی نے حدیثِ صحیح کو درجات و مراتب کے اعتبار سے سات اقسام میں تقسیم کیا ہے:

(۱) جو روایات بخاری و مسلم دونوں میں پائی جائیں، ان کا درجہ نسبتاً بلند ہے۔
(۲) جو صرف صحیح بخاری میں پائی جائیں۔
(۳) جو صرف صحیح مسلم میں درج ہوں۔
(۴) ان کے بعد وہ احادیث ہیں جو صحیحین کے معیار اور شرائط کے مطابق ہوں۔
(۵) ان کے بعد احادیث کا وہ طبقہ ہے جو امام بخاری کی شرائطِ روایت کے مطابق ہو۔
(۶) پھر وہ احادیث ہیں جو صرف امام مسلم کے شرائط کے مطابق ہوں۔
(۷) آخر میں صحیح احادیث میں ان روایات کا نمبر ہوگا، جن کی تصحیح ان کے علاوہ دوسرے ائمہ حدیث نے کی ہو۔

صحیح حدیث کی تقسیم کا ایک انداز بلاد و امصار کے لحاظ سے متعین کیا گیا ہے۔ مثلاً اکثر علما نے حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ اہلِ مدینہ کی احادیث جسے دار السنۃ کہنا چاہیے، آحاد، مستند اور صحیح ہیں۔

نقادانِ فن جب یہ کہتے ہیں کہ "ھٰذا حدیثٌ صحیحٌ" تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ حدیث سند اور متن دونوں پہلوؤں سے صحیح ہے۔ لیکن جب یہ کہتے ہیں کہ یہ صحیح الاسناد ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک سلسلۂ اسناد کا تعلق ہے، یہ قطعی صحیح ہے۔ رہا متن کا معاملہ تو ہو سکتا ہے اس میں علت و شذوذ پایا جائے۔ تصحیح کا محدثین کے ہاں ایک اسلوب یہ ہے کہ بعض احادیث کے بارے میں وہ کہتے ہیں: "اصح شیٔ فی ھذا الباب کذا" کہ اس باب میں یہ صحیح ترین حدیث ہے جو مل سکی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اگرچہ یہ حدیث ضعیف ہے، تاہم اس میں ضعف کم ہے۔ اور اس باب میں اس سے ارجح، فائق اور کوئی حدیث پائی نہیں جاتی۔

حدیثِ حسن

یہ حدیث کی وہ قسم ہے جس میں سند متصل اور موصول ہو، اور ناقل اگرچہ وصفِ عدالت سے موصوف ہو تاہم اس میں ضبط نسبتاً کم ہو۔ نیز یہ کہ اس میں علت و شذوذ نہ پایا جائے۔ اس میں اور حدیثِ صحیح میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ جہاں حدیثِ صحیح میں راوی کا تام الضبط ہونا شرط ہے وہاں حسن میں اگر راوی خفیف الضبط ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ان دونوں قسموں میں چونکہ علت و شذوذ نہیں ہوتا اس لیے دونوں ہی حجت و مستند ہیں اور دونوں کے مضمون کو بطور استدلال و استشہاد کے پیش کیا جا سکتا ہے۔

حسن کی دو قسمیں ہیں۔ حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ۔ لیکن جب مطلقاً کسی حدیث کو حسن قرار دیا جائے تو اس کے معنی حسن لذاتہ کے ہوں گے۔

حسن لذاتہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حسن ہونا ایسے امر کا باعث ہے جو اس کی ذات میں داخل ہے خارجی شی کی بنا پر نہیں، اس کو قریب قریب صحیح ہی سمجھا جاتا ہے، اگرچہ اس کے رجال میں ضبط و اتقان وہ عالم نہیں ہوتا، جو حدیثِ صحیح کے ساتھ خاص ہے۔

حسن لغیرہ سے مراد ایسی روایت ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں کوئی راوی مستور ہو۔ یعنی ایسا راوی جس کی اہلیت اور عدمِ اہلیت متحقق نہ ہو۔ لیکن اس کا کوئی راوی مغفل، کثیر الخطا یا متہم بالکذب نہیں چاہیے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تائید کسی متابع اور شاہد سے ہوتی ہو۔

جامع ترمذی میں سب سے پہلے حسن کی تعریف سے تعرض کیا گیا ہے۔ خطابی نے بھی اس کی تعریف بیان کی ہے اور دونوں پر اس بارے میں نقد وجرح سے کام لیا گیا ہے۔ ترمذی نے حدیث کو حسن، صحیح اور ضعیف کے تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ضعیف کی ترمذی نے دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک وہ جس میں ضعف اس درجہ کا نہ ہو کہ اس پر عمل کرنا ممتنع ہو اور دوسری وہ جس کا ترک کر دینا ہی انسب و اولیٰ ہو۔ اول الذکر ترمذی کے نزدیک حسن کے مشابہ ہے اور ثانی الذکر واہی اور ناقابلِ اعتنا۔ ترمذی میں احادیث کے بارے میں ایک عام اسلوب یہ اختیار کیا گیا ہے کہ بعض سے متعلق تو وہ کہتے ہیں کہ 'حدیث حسنٌ صحیحٌ'، اور بعض کے بارے میں کہتے ہیں 'حدیث حسنٌ غریبٌ'، ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، ورنہ گڑبڑ کا اندیشہ ہے۔ حسنٌ صحیحٌ کے معنی یہ ہیں کہ یہ مطلق حسن سے درجے میں بلند ہے لیکن صحیح سے کم درجے کی ہے۔ ان دونوں میں تطبیق کی کیا شکل ہے۔ حافظ ابنِ حجر نے اس کو اس مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ بعینہٖ اس طرح ہے جیسے کسی راوی کے بارے میں کہا جائے "صَدُوقٌ" اور کسی کے متعلق کہا جائے "صَدُوقٌ ضابطٌ" تو صرف 'صدوق' کہنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا رتبہ صحیح بخاری کے رجال سے کم ہے۔ اور 'صدوقٌ ضابطٌ' کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا وہی درجہ ہے جو صحیح بخاری کے رجال کا ہے۔ جس طرح ان دونوں میں تطبیق ممکن ہے، اسی طرح صحیح اور حسن میں تطبیق ممکن ہے۔

رہا یہ کہ ترمذی میں بعض اوقات حسن صحیح کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ غریب ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حدیث صحیح کبھی کبھی صرف ایک ہی طریق سے مروی ہوتی ہے، اس صورت میں اسے غریب کہا جاتا ہے۔ حسن لذاتہٖ اگر دوسرے طرق سے بھی مروی ہو تو یہ صحیح کے درجے پر فائز ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متابعت کی صورت میں یہ خطرہ زائل ہو جاتا ہے کہ اس کے رواۃ میں کوئی سوءِ حفظ کا شکار ہے۔ یا اس پر اس کے ضبط و اتقان کی جہت سے کوئی اعتراض ابھرتا ہے۔ اس کی مثال یہ حدیث ہے:

لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلاۃ۔

اگر میں امت پر اس کو گراں خیال نہ کرتا تو حکم دیتا کہ ہر نماز سے پہلے مسواک کر لیا کریں۔

یہ حدیث حسن لذاتہٖ اور صحیح لغیرہٖ ہے۔

یہ محمد بن عمرو سے مروی ہے، انھوں نے ابی سلمہ سے روایت کی اور ابی سلمہ نے ابی ہریرہ سے۔ محمد بن عمرو [illegible] سے [illegible] اسی کی [illegible] ہے۔ لیکن اس حدیث کی تائید ہو کر

دوسرے طرق سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی ابو ہریرہ سے اور بہت سے لوگوں نے اس کی روایت کی ہے، جیسے الاعرج بن ہرمز اور سعید المقری وغیرہ۔ اس لیے اس کو صحیح کے مرتبے کی حدیث سمجھا جائے گا۔ یہ درست ہے کہ حسن کی طرف پہلے پہل ترمذی ہی نے توجہ دلائی۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو، اس کے اوپر کے طبقہ او مشائخ میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، جیسے امام بخاری اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کی تالیفات۔ ابن الصلاح کا کہنا ہے کہ حسن کی مثالیں زیادہ تر سنن ابو داؤد میں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ خود ان کا اپنا قول ہے کہ میں نے "اس میں احادیث صحیحہ کا ذکر بھی کیا ہے، جو صحیح کے مشابہ یا قریب تر ہیں اور جن روایات میں وہن و ضعف پایا جاتا ہے، اس کی میں نے وضاحت کر دی ہے۔ لیکن جن احادیث کے بارے میں کسی وہن و ضعف کی تصریح نہیں کی ہے، وہ بہرحال صالح اور استدلال و عمل کے لائق ہے، اور بعض احادیث بعض کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہیں۔"

علامہ بغوی (حافظ عبدالرحیم بن حسین زین الدین بغدادی عراقی) نے مصابیح السنۃ میں، حسن اور صحیح میں جو باریک فرق ہے، اس کو اس طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ صحیح اس حدیث سے تعبیر ہے جو شیخین کے ہاں پائی جائے یا جس کی تخریج صرف مسلم کریں۔ باقی کتب میں جو احادیث ہیں، ان کو حسن کے زمرے میں شمار کرنا چاہیے۔

علامہ بغوی کی اس اپج پر اکثر لوگوں نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ اس نئی اصطلاح کے لیے کوئی وجہ جواز پائی نہیں جاتی۔ خصوصیت سے ان کی رائے کو اس وجہ سے بھی تسلیم نہیں کیا گیا کہ خود انھوں نے اپنی کتاب مصابیح السنۃ میں اس بات کا التزام نہیں کیا کہ اس میں صرف احادیث صحیحہ کا اندراج کریں گے، بلکہ اس میں ایسی احادیث بھی لے آئے ہیں جن کے رواۃ عادل و ضابط نہیں۔

نقادانِ فن جہاں حدیث کو صحیح اور حسن کے ناموں سے پکارتے ہیں، وہاں ان کے ہاں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اور اصطلاحیں بھی ہیں، جیسے جید، مجوّد، قوی، ثابت، محفوظ، معروف، صالح اور مستحسن۔

ان اصطلاحات کی بوقلمونی کے باوصف سب اس ایک حقیقت پر دلالت کناں ہیں کہ ان القاب سے ملقب احادیث مقبول اور شائستہ استدلال ہیں، چاہے وہ صحیح کے زمرے میں داخل ہوں یا حسن کے مرتبۂ و درجے کی ہوں۔ حسن و صحیح کے بارے میں یہ جان لینا ضروری ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی وضاحت کر چکے ہیں کہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ جہاں تک سلسلۂ اسناد کا تعلق ہے یہ حسن یا صحیح ہے۔ جہاں تک متن

سکتا ہے کہ وہ معلل یا شاذ ہو۔ یہی مطلب ہے ان کے اس مشہور قول کا:

ما کل ما صح سنداً صح متناً۔

یہ ضروری نہیں کہ جو حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہو وہ متن کے اعتبار سے بھی صحیح ہو۔

حدیثِ ضعیف

یہ حدیث کی تیسری قسم ہے، اس کی بہترین تعریف یہ ہے کہ یہ روایت کی اس نوع سے تعبیر ہے جس میں صحیح اور حسن کی صفات نہ پائی جائیں، یا جسے صحیح اور حسن کے پایہ کی روایت نہ قرار دیا جاسکے۔ کچھ لوگوں نے ان صفات کے فقدان کی رُو سے ضعیف کو ۴۹ اقسام میں تقسیم پذیر ٹھہرایا ہے، لیکن ان میں اکثر ایسی ہیں جو واقعی نہیں اور نہ ان کا کوئی متعین نام ہی تجویز کیا جاسکتا ہے۔ ابن الصلاح نے اس کی ۴۲ صورتوں کی نشاندہی کی ہے اور حافظ عراقی نے اس کی تائید کی ہے۔ ہم ان میں صرف ان اقسام سے تعرض کریں گے جو محدثین کے حلقوں میں معروف اور متداول ہیں۔

مرسل

اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں راوی متعین صحابی کا نام لیے بغیر یہ کہدے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ یا آنحضرتؐ نے یہ بات کی۔ یا آپ کے سامنے یہ فعل ہوا، اور آپ نے اس پر سکوت فرمایا۔ مثلاً نافع یہ کہہ دیں کہ آنحضرتؐ نے یہ ارشاد فرمایا اور اس صحابی کا ذکر نہ کریں جن سے انھوں نے سنا۔

مراسیل حجت و مستند ہیں یا نہیں، اس کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ حفاظِ حدیث اور نقادانِ فن کا ایک طبقہ یہ رائے رکھتا ہے کہ مراسیل حجت نہیں۔ چنانچہ امام مسلم نے بھی اس طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اہلِ علم مراسیل کو حجت نہیں مانتے۔

اکثر علما کی رائے میں جہاں تک مراسیلِ صحابہ کا تعلق ہے، انھیں ضعیف نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں اور یہ ہوسکتا ہے کہ ایک صحابی نے بذاتِ خود آنحضرت سے نہ سنا ہو بلکہ کسی دوسرے صحابی سے سنا ہو، جس کا سماع آنحضرتؐ سے متحقق ہو۔ اس صورت میں سلسلۂ اسناد میں اس صحابی کا ذکر نہ ہونا مضر نہیں۔ سیوطی نے کہا ہے کہ صحیحین میں مراسیلِ صحابہ کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے، اس لیے ان کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ ہاں اگر صحابہ میں سے کوئی تابعی سے روایت کرے تو اس کے ماننے میں البتہ تامل ہوسکتا ہے، کیونکہ اس نوع کی احادیث یا تو موقوفات کے درجے کی ہیں، یا ان کا تعلق سراسر اسرائیلیات سے ہے۔

مراسیل کے کئی درجے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی مرسل حدیث وہ ہے جو ایسے صحابی سے مروی ہو جس کا سماع ثابت و متحقق ہو۔ اس کے بعد وہ مراسیل ہیں جن میں صحابی کی رویت تو ثابت ہو لیکن سماع ثابت نہ ہو۔ اس کے بعد وہ روایات ہیں جن کا تعلق مخضرمین سے ہو۔ تابعین میں سعید بن مسیب کے مراسیل کا ایک مقام ہے۔ ان کے بعد شعبی اور مجاہد کی مراسیل کا درجہ ہے۔

جہاں تک صغار تابعین کا تعلق ہے، جیسے قتادہ، زہری اور حمید الطویل۔ ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ بالعموم ان کی روایات کا ماخذ تابعین ہی ہیں۔

مراسیل جب ثقات سے مروی ہوں تو ان میں بلاشبہ ایک گونہ قوت پیدا ہوجاتی ہے، لیکن ان میں اور ان روایات میں جو مراسیل مسندہ کے قبیل سے ہیں اگر تعارض پیش آئے تو مراسیل مسندہ کو استدلال کے اعتبار سے ارجح قرار دیا جائے گا۔

منقطع

منقطع اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے سلسلۂ اسناد میں ایک راوی ساقط ہو، یا اس میں ایسے شخص کا ذکر ہو جو مبہم ہو یعنی جس کی شخصیت متحقق نہ ہو۔ اس کو منقطع اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس میں سند کا اتصال و تسلسل قائم نہیں رہتا۔ اس کی مثال عام طور پر یہ حدیث بیان کی جاتی ہے۔

ان ولیتموھا ابا بکر فقوی امین۔

اگر تم ابوبکر کو خلیفہ مقرر کرو تو وہ قوی اور امین ہیں۔

یہ حدیث عبدالرزاق سے مروی ہے اور عبدالرزاق نے ثوری سے روایت کی ہے اور ثوری نے ابی اسحاق سے، اور ابی اسحاق نے زید بن یثیع سے اور انھوں نے حذیفہ سے اس کو مرفوعاً نقل کیا ہے۔ اس میں ثوری اور ابی اسحاق کے مابین ایک راوی شریک ہے، جو ساقط ہے۔ اس لیے کہ ثوری کا ابی اسحاق سے بلاواسطہ سماع ثابت نہیں۔

مبہم راوی کے سلسلے میں عموماً اس حدیث کو پیش کیا جاتا ہے۔

اللھم انی اسئلک الثبات فی الامر

اے اللہ میں جملہ امور میں تجھ سے ثبات قدمی کا طالب ہوں۔

اس کو ابوالعلاء بن عبداللہ بن الشخیر نے دو شخصوں کی وساطت سے شداد بن اوس سے روایت کیا ہے

لیکن یہ دو شخص کون ہیں؟ اس کی تصریح سند میں مذکور نہیں۔

معضل

معضل اس حدیث سے تعبیر ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں دو یا دو سے زیادہ راوی ایک ساتھ ساقط ہوں۔ اسے منقطع کی ایک نوع قرار دیا جاتا ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ہر معضل تو منقطع ہوتی ہے لیکن ہر منقطع کا معضل ہونا ضروری نہیں۔

تدلیس

تدلیس کی دو معروف قسمیں ہیں، تدلیس اسناد، اور تدلیس شیوخ۔ تدلیس اسناد کا مطلب یہ ہے کہ راوی اپنے ایسے معاصر سے روایت کرے جس سے وہ ملا ہے لیکن سماع ثابت نہ ہو۔ یا ایسے معاصر سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی، لیکن روایت سے یہ شبہ ابھرتا ہو کہ اس نے اسے سماع کے بعد نقل کیا ہے۔

اس کی مثال علی بن خشرم کا یہ قول ہے کہ ہم سفیان بن عیینہ کے پاس بیٹھے تھے، انھوں نے ایک روایت بیان کی اور کہا کہ زہری نے یوں کہا ہے۔ اس پر ان سے دریافت کیا گیا، کیا آپ نے اسے براہ راست زہری سے سنا ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ مجھے عبدالرزاق نے بتایا، اور عبدالرزاق کو معمر نے، اور معمر کو زہری نے۔ سفیان بن عیینہ زہری کے معاصر ہیں اور ان کا لقا بھی ثابت ہے۔ اس پر بھی انھوں نے بجائے براہ راست زہری سے روایت کرنے کے عبدالرزاق اور معمر کی وساطت اختیار کی، اور روایت کو اس انداز سے بیان کیا کہ گویا انھوں نے زہری سے خود سنا ہے، ممکن ہے تدلیس سے ان کی مراد توزع ہو، تعمیہ نہ ہو، کیونکہ ان کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ یہ کھلی ہوئی تدلیس سے کام لیں۔

ائمہ حدیث تدلیس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے، اس کے متعلق شعبہ کے اس قول سے اندازہ کیجیے۔

التدلیس اخو الکذب۔

تدلیس کذب ہی کا بھائی ہے۔

ان کا یہ قول بھی ہے:

لان ازنی احب الی من ادلس۔

یعنی تدلیس زنا سے بھی بدتر ہے۔

امام شافعی اس شخص کی روایت کو مسترد کر دیتے ہیں جو تدلیس کا مرتکب ہو۔

جمہور علما کا کہنا ہے کہ اگر راوی سماع کی تصریح کر دے تو اس کی روایت تدلیس کے باوجود قبول کر لی جائے گی اور اگر تصریح نہ کرے اور ایسی عبارت استعمال کرے جو مبہم اور شک میں ڈالنے والی ہو تو اس کا رد کر دینا ہی اولیٰ ہے۔

حاکم نے تدلیس کے اعتبار سے اسلامی بلاد و امصار کا جائزہ لیا ہے اور کہا ہے کہ حجاز، حرمین، مصر والی، خراسان، اصبہان، بلادِ فارس و خوزستان اور ماوراء النہر کے ائمہ حدیث کے ہاں تدلیس نہیں پائی جاتی۔ تدلیس سے زیادہ تر اہلِ کوفہ نے کام لیا ہے۔ اہلِ بصرہ میں کم لوگوں نے تدلیس کا ارتکاب کیا ہے۔ اسی طرح علمائے بغداد میں بھی سوا ابوبکر محمد بن محمد بن سلیمان باغندی کے کوئی بھی تدلیس سے متہم نہیں۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے یہاں تدلیس کی طرح ڈالی۔

تدلیس الشیوخ کا مطلب یہ ہے کہ راوی شیخ کا نام لینے کے بجائے اس کے القاب و اوصاف کا ذکر کرے، مثلاً یہ کہ: حدثنا العلامۃ الثبت۔ کہ ہم سے علامہ اور ثبت و عدل نے حدیث بیان کی۔ یا الحافظ الضابط، یا ایسے شخص نے حدیث بیان کی جو حافظ و ضابط ہے۔ تدلیس الشیوخ میں وہ روایات بھی شامل ہیں جو ایک ہی شخص سے مروی ہوں، لیکن ان کو مختلف ناموں سے پکارا جائے۔ ابن الصلاح نے اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً خطیب بغدادی اپنی کتابوں میں ابوالقاسم، عبیداللہ بن ابی الفتح اور عبیداللہ بن احمد بن عثمان الصیرفی سے روایت کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ یا حسن بن محمد الخلال، حسن بن ابی طالب اور ابی محمد الخلال سے روایت کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک ہی شخص ہے جو مختلف ناموں سے موسوم ہے۔ سفیان بن عیینہ کی طرح خطیب کے بارے میں بھی ان کی جلالت قدر کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ تدلیس سے ان کا مقصد تعمیہ نہیں بلکہ ایک ہی شخص کے مختلف ناموں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

بعض علما نے تدلیس کی کچھ اور قسمیں بھی بیان کی ہیں۔ مثلاً ایک تدلیس عطف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی یہ کہے حدثنا فلان و فلان۔ حالانکہ اس نے اس دوسرے شخص سے نہ سنا ہو۔

ایک تدلیس سکوت ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ راوی سمعت یا حدثنا کہہ کر خاموش ہو جائے، اور پھر کسی راوی کا نام لے لے، حالانکہ اس سے اس کا سماع ثابت نہ ہو۔

انہی دو قسموں سے ملتی جلتی ایک قسم یہ ہے کہ راوی بعض شیوخ کا نام بربنائے ضعف سلسلۂ اسناد میں سے حذف کردے اور صرف ثقات ہی کا ذکر کرے۔ یہ تدلیس کی بدترین قسم ہے۔ ولید بن مسلم اس بارے میں بہت بدنام ہیں۔ یہ سلسلۂ اسناد میں سے اکثر اوزاعی کے ان شیوخ کا نام نہیں لیتے جو ضعف سے متصف ہیں۔ بلکہ صرف انہی شیوخ کا ذکر کرتے ہیں جو ثقہ ہیں۔ محدثین نے ان کی تدلیس کی توجیہات بھی پیش کی ہیں۔ ابو مسہر کا کہنا ہے کہ اگر یہ ثقات سے روایت کریں تو روایت مقبول ہوگی ورنہ نہیں۔

تدلیس بلاد کو بھی انہی اقسام میں شمار کرنا چاہیے۔ مثلاً کوئی مصری کہدے، حدثنی فلان بالاندلس۔ کہ فلان شخص نے مجھ سے یہ حدیث اندلس میں بیان کی اور اس سے مراد فراتہ کے قریب وہ مقام ہو جس کو اناس کہا جاتا ہے۔ یا کہہ دے حدثنی فلان بما وراء النہر۔ اور اس سے مقصود نہر دجلہ ہو۔ اس طرح کی مشتبہ عبارات سے دھوکا ہوتا ہے کہ راوی نے طلب حدیث کے سلسلے میں باقاعدہ سفر کی صعوبتیں برداشت کی ہیں، حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔

معلل

معلل حدیث کی اس قسم کو کہتے ہیں۔ جو جہاں تک سند کا تعلق ہے صحیح ہو۔ لیکن اس میں کوئی ایسی علت قادحہ پائی جائے، جس کی وجہ سے یہ ناقابل اعتبار ہو جائے۔ کسی حدیث کی تعلیل بیان کرنا یا اس بات کی پردہ کشائی کرنا کہ اس میں یہ علت و نقص ہے، علوم حدیث کا ایک اہم شعبہ ہے، اور یہ وسیع تر اطلاع، قوی تر حافظہ اور فہم دقیق چاہتا ہے۔ ابن حجر کا کہنا ہے کہ یہ علوم حدیث میں نہایت غامض اور نازک علم ہے۔ اور اس سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فہم ثاقب، حفظ واسع اور معرفت تامہ سے نوازا ہو۔ یعنی جو مراتب رواۃ سے آگاہ ہو اور اسانید و متون کے فہم و ادراک کے معاملے میں پورا پورا ملکہ رکھتا ہو۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے کہ حدیث کی جانچ پرکھ ایک طرح کا الہام ہے۔ چنانچہ اگر تم کسی ایسے عالم سے جو کسی حدیث کی تعلیل بیان کر رہا ہو، یہ پوچھ بیٹھو کہ اس پر تمہارے پاس کیا دلیل ہے تو وہ دلیل پیش نہ کر سکے انہی سے دریافت کیا گیا کہ آپ جو حدیث سن کر یہ کہہ دیتے ہیں یہ صحیح ہے اور یہ صحیح نہیں تو آپ کے سامنے کیا معیار ہوتا ہے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ تم بتاؤ کہ تم جب دراہم کو کسی نقاد کے پاس لے جاتے ہو، اور وہ بیک نظر بھانپ لیتا ہے کہ اس میں کون کھرا اور کون کھوٹا ہے تو کیا اس وقت تم اس کی بات مان لیتے ہو، یا یہ پوچھتے ہو کہ تمہارے پاس کھوٹے اور کھرے کی پہچان کا معیار کیا ہے؟

یہ علم محدثین کے حلقوں میں بیٹھنے اور استفادہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ چونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ایک مشکل اور قابل فن ہے اس لیے اس پر تصانیف کا دائرہ بھی محدود رہا ہے۔ اس موضوع پر جن لوگوں نے طبع آزمائی کی ان میں سرفہرست بخاری کے شیخ علی بن مدینی ہیں، ان کی کتاب کا نام "کتاب العلل" ہے۔ اسی عنوان سے خلال نے بھی ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ ابن ابی حاتم کی ایک کتاب بھی علل کی تشریح پر مشتمل ہے۔ اسی فن سے متعلق امام احمد بن حنبل کے ایک مخطوطے کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس باب سے متعلق ایک جلیل القدر اور بے نظیر کتاب ابوالحسن دارقطنی کی ہے، جس کے جامع ان کے شاگرد حافظ ابوبکر البرقانی ہیں۔ ان کے علاوہ جن لوگوں نے علل کو نکھارنے کا فریضہ انجام دیا ان میں امام بخاری، یعقوب ابن ابی شیبہ، الساجی، ابن جوزی اور ابن حجر کا نام قابلِ ذکر ہے۔

تعلیل کا تعلق چونکہ اسناد سے ہے، اور اس حقیقت کے جاننے سے ہے کہ کسی راوی نے وہم سے تو کام نہیں لیا، یا اس حدیث کو مرسل تو قرار نہیں دیا، جو سند کے اعتبار سے موصول ہے۔ یا مرفوع کو موقوف تو نہیں ٹھہرایا۔ یا ایسا تو نہیں ہوا کہ ایک کے اجزا میں کوئی دوسری حدیث شامل کر دی گئی ہو، اس لیے یہ نہایت مناسب ہے کہ مسند اور موصول احادیث میں علل کی نشاندہی کی جائے، جیسا کہ خود راوی کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنی مرویات کی علت بیان کر دے۔

حدیث معلل کو معلوم کرنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ تمام وجوہ روایت پر غور کیا جائے، رواۃ کے اختلافات پر نظر ڈالی جائے اور ان کے ضبط و اتقان کی چھان بین کی جائے۔ یہی مطلب ہے علی مدینی کے اس قول کا۔

الباب اذا لم تجتمع طرقه لم يتبين خطوه۔

کہ جب تک تمام طرقِ روایت کا استیعاب نہ کیا جائے، یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس میں خطا اور غلطی کی نوعیت کیا ہے۔

حاکم نے "معرفۃ علوم الحدیث" میں علل کی دس قسمیں بیان کی ہیں اور کہا ہے کہ باقی احادیث میں بھی ان کی روشنی میں، علل کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔

(باقی آئندہ)